



Journal of Frontiers in Multidisciplinary Research

Psychological Critic of Urdu Fiction: Dr. Saleem Akhtar

Dr. M Abu Bakar Faruqi ^{1*}, Ambreen Amjad ², Hina Malik ³

¹⁻³ Lecturer, Urdu, University of Gujarat, Gujarat, Pakistan

* Corresponding Author: Dr. M Abu Bakar Faruqi

Article Info

E-ISSN: 3050-9726

P-ISSN: 3050-9718

Volume: 06

Issue: 01

January-June 2025

Received: 05-04-2025

Accepted: 04-05-2025

Published: 02-06-2025

Page No: 302-304

Abstract

Dr Saleem Akhtar is a renowned Psychoanalyst critic of Urdu literature. He has produced numerous psychoanalytical studies of urdu literature. This paper analyzes his psychoanalytical critique of urdu short story to understand his contribution to urdu literary criticism.

DOI: <https://doi.org/10.54660/JFMR.2025.6.1.302-304>

Keywords: Psychoanalysis in Urdu Literature, Psychological Themes in Urdu Novels, Character Psychology in Urdu Fiction

Introduction

اردو تنقید کو نفسیاتی جہات سے جن ناقدین نے آشنا کیا ان میں سلیم اختر ایک اہم نام ہیں۔ اور فکشن کی تنقید میں خاص طور پر سلیم اختر کو واحد معتبر نفسیاتی نقاد کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کے نفسیاتی مطالعے جس تواتر اور تندہی سے کیے ہیں اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ سلیم اختر کا بنیادی تنقیدی رویہ نفسیاتی ہوتا ہے۔ گو یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ صرف نفسیاتی تنقید سے کسی فن پارہ کی تفہیم نہ ممکن ہے اور نہ مکمل مگر اس سے فن کار کے داخل اور کرداروں کے باطن میں اترنے کا موقع ضرور ملتا ہے جس سے فن پارہ کی ان ہمارے دیکھی دنیا سے آگہی ضرور ہوتی ہے۔ اور یہ ہی جہت (نفسیاتی) سلیم اختر کی تنقید کو “خالص مدرسانہ تنقید” سے بڑی حد تک بچا لے جاتی ہے ہاں جو “مدرسانہ تنقید” کے مباحث ہیں ان میں عام طور پر ایک طرف تو کسی “مدرس” کی لکھی ہوئی تنقید کو مدرسانہ تنقید کہا جاتا ہے اور دوسری طرف تدریسی ضرورتوں یا نصاب میں شامل موضوعات اور تخلیق کاروں پر لکھی ہوئی تنقید کو مدرسانہ تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس ذیل میں حقیقت محض اتنی نہیں۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ ایک “مدرس” تنقید لکھے اور وہ مدرسانہ تنقید نہ ہو مثلاً حسن عسکری اور گوپی چند نارنگ جیسے ناقدین کی تنقید ان کے مدرس ہونے کے باوجود “مدرسانہ تنقید” کی ذیل میں نہیں آتی۔ جب کہ ایک غیر مدرس نقاد کی تنقید “مدرسانہ تنقید” ہو سکتی ہے۔ مثلاً انور سدید کی پیش تر تنقید غیر مدرس ہونے کے باوجود تدریسی نوعیت کی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ نصاب میں شامل موضوعات یا شخصیات پر لکھی ہوئی تنقید ضرور “مدرسانہ تنقید” کے ذمہ میں آئے۔ مثلاً میر تقی میر پر حسن عسکری کے مضامین اس ذیل میں نہیں آ سکتے جب کہ سید عبداللہ اور فرمان فتح پوری کی میر تقی میر پر کتابیں بلاشبہ تدریسی تنقید کی مثالیں ہیں۔ پھر یہ کہ “مدرسانہ تنقید” کی اپنی ایک اہمیت بہرحال سلیم اور ضرورت ہے۔ جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی ادب میں مدرسانہ تنقید کے بغیر عالمانہ تنقید پیدا کی جا سکتی ہے اختر کی تنقید جس کا غالب رجحان تدریسی ہے (جو نقاد کا کوئی قابل ذکر عیب نہیں۔ یہ بات الگ کہ عالمانہ تنقید کو بہرحال تدریسی تنقید پر فوقیت ضرور حاصل ہے) علم نفسیات سے متعلق ہونے کی وجہ سے فکر و نظر کو نئے زاویوں سے روشناس کرانے میں معاون ہے۔ مثلاً ان کا ایک مضمون “افسانوی تنقید کا نفسیاتی مطالعہ” بلاشبہ خاصے کی چیز ہے اور افسانے پر لکھے جانے والے اردو کے بہترین علمی اور تنقیدی مضامین میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ “جدید نفسیات نے ذہنی اعمال کی تشریح و تحلیل میں جس بصیرت کو عام کیا اس سے افسانوی تکنیک میں بھی انقلاب برپا تلازمہ اور شعور کی رو سے پہلے افسانوی ”ہوا“ (۱) اور یہ انقلاب تلازم خیالات کے اصول اور شعور کی رو کے نظریے سے آیا، سلیم اختر لکھتے ہیں تکنیک میں بالعموم اور پلاٹ کی تشکیل میں بالخصوص نظم و ضبط کا اور ترتیب و توازن کا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی لحاظ رکھا جاتا تھا جس کے نتیجے میں کردار، واقعات کی سیڑھی پر مصنف کی انگلی پکڑے آرام سے چڑھتے جاتے چنانچہ کردار نگاری کا ایک مخصوص انداز مقرر ہو چکا تھا۔ ابتدا میں کردار کا تعارف کرایا جاتا اور کرداری خصائص بیان ہوتے۔۔۔ یوں ان کی روشنی میں کردار ابھارا جاتا۔۔۔ علاوہ ازیں واقعات کے بیان میں کیوں کہ زمانی تسلسل اور ترتیب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا اس لیے کہانی کی اساس پلاٹ پر استوار تھی، کہانی میں پلاٹ ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اس میں جھول عیب اور بغیر پلاٹ کے کہانی کفر! تلازمہ اور شعور کی رو نے اگر ایک طرف پلاٹ پر کاری ضرب لگانی تو دوسری طرف کردار نگاری کا روایتی انداز یک سر بدل دیا۔۔۔ اب (-) واقعات کا زمانی تسلسل ضروری نہ رہا۔۔۔ کردار کی سوچ کو واقعات پر فوقیت دے کر ذہنی ڈرامہ کو خارجی واقعات کا مظہر قرار دے دیا

یعنی پرانی کہانیوں میں کرداروں کے عمل یا واقعات کے تانے بانے کو اہمیت دی جاتی تھی لیکن اب اس کے برعکس نفسی واردات سے جنم لینے والی داخلی کش مکش اور باطنی کیفیات کی عکاسی کو مقصود فن سمجھا جانے لگا۔ لہذا اب نقطہ عروج جو پلاٹ کا سب سے اہم حصہ تصور ہوتا ہے، محض واقعات کو الجھا دینے سے جنم نہیں لیتا بل کہ بقول سلیم اختر ”خود کرداروں کی داخلی کش مکش نقطہ عروج کا باعث بنتی ہے“ (۳) اور اس کے لیے سلیم اختر ”نفسی نقطہ عروج“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سلیم اختر کے ہاں، پرانی کہانیوں سے مراد داستانوی اور قدیم ناولوں کی کہانیاں ہیں۔ جدید نفسیات کا عمل دخل اور نفسی کیفیات کا بیان انہیں پریم چند کے ہاں سے نظر آتا ہے۔ اسی لیے وہ لکھتے ہیں

افسانوں میں پریم چند نے شعوری طور سے اس کا التزام روا رکھا کہ ”کرداروں کی نفسی کیفیات سے نقطہ عروج جنم لے چنانچہ ان کے ”زیور کا ڈبہ“ ایسے عام افسانے سے لے کر ”کفن“ ایسے کامیاب افسانہ تک میں نقطہ عروج کی کامیاب مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پریم چند کے بعد منٹو، عصمت، بیدی اور ندیم کے افسانوں میں نفسی نقطہ عروج کا کامیاب مظاہرہ ہے“ (۴) ملتا ہے

اس کے بعد وہ فطری اور نفسیاتی کردار نگاری میں باریک مگر اہم فرق کی وضاحت کرتے ہیں اور کامیاب کردار کا معیار ”نفسیاتی ہونا“ قرار دیتے ہیں۔ ان کی اس وضاحت سے منٹو کے افسانے ”بتک“ کی سوگندھی کے کردار پر عابد علی عابد کا اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں

فطری کردار نگاری انسانی زندگی کے بارے میں ان مشاہدات و تجربات کے اعادے کا نام ہے جو عقل عامہ کی کسوٹی پر بھی پرکھے جا سکتے ہیں۔ فطری کردار نگاری کی اساس اس انداز نظر پر استوار ہے کہ افراد میں عمومی لحاظ سے جو خصوصیات ملتی ہیں، ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض نفسی کیفیات افراد کی عمومی خصوصیات کی خلاف ورزی ہی کا نام ہیں۔ اسے اس مثال سے سمجھیے۔۔۔

پریم چند کے کفن کا ہیرو نفسیاتی کردار ہے کیوں کہ ہر آدمی بیوی کا کفن بیچ کر نشے میں دھت نہیں ہو سکتا۔ نفسیاتی کردار فطری بھی ہوگا۔ کیوں کہ اس کی بو العجیبیاں یا غیر معمولی پن استثنائی ہونے کے باوجود بھی انسانی فطرت کے دائرے سے باہر نہیں لیکن ہر فطری کردار کا نفسیاتی ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے کامیاب کردار کا معیار اس کا محض فطری ہونا نہیں۔ بل کہ نفسیاتی ہونا قرار پاتا ہے۔ یہ ہی نہیں نفسیاتی کردار میں فطری کردار کی خصوصیات بھی ملتی ہیں اگر اس لطیف فرق کو ملحوظ رکھا جاتا تو عابد علی عابد صاحب ”اصول انتقاد ادبیات“ میں منٹو کے افسانے ”بتک“ میں طوائف کی کردار نگاری پر کبھی بھی اعتراض نہ کرتے کیوں کہ سوگندھی کا کردار فطری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بھی ہے اگر محض فطری (۵) ہوتا تو وہ گابک کے طرز عمل سے کبھی بھی بتک محسوس نہ کرتی

لہذا اسی بنیاد پر وہ نفسیاتی افسانہ کی تعریف ان الفاظ میں وضع کرتے ہیں

جب افسانہ نگار لاشعوری محرکات کے ذریعہ کرداری بو العجیبوں اور بعض کج رویوں کا مطالعہ کر کے نفسی پیچیدگیوں کی گہری کھولے اور سائیکی کے طلسم خانہ کو منور کر لیں تو ایسا افسانہ نفسیاتی افسانہ ہوگا۔ اسی معیار کے مطابق افسانوں کا جائزہ لیں تو ممتاز مفتی کے بیش تر افسانے اور منٹو اور عصمت کے بعض افسانے بہت اچھی مثالیں لیکن سلیم اختر یہ تعریف پیش کرنے کے بعد اس ضمن میں احتیاط (۶) نہیں کو لازم قرار دیتے ہیں کیوں کہ اگر افسانہ نگار شعوری کوشش اور غیر ضروری طور سے افسانے کو نفسیاتی بنائے تو پھر یہ افسانہ، افسانہ بننے کی بجائے کیس بسٹری میں تبدیل ہو جائے گا جو یقیناً غیر تخلیقی پن کا اظہار ہوگا، جسے قبول نہیں کیا جا سکتا

سلیم اختر اردو تنقید کے ان ناقدین میں سے ہیں جو ابلاغ سے عاری اور بے معنی اظہار کو احسن تخلیقی رویہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ ایسی تخلیقات کو ستائش کی نظر سے نہیں دیکھتے جو قاری تک اپنا ابلاغ نہ کریں چاہے ان میں کیسا ہی نفسیاتی تجربہ اور نفسی کیفیت کا بیان کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اس ضمن میں سلیم اختر کا موقف دو ٹوک ہے۔ لکھتے ہیں

بعض لکھنے والوں نے اس (آزاد تلازمہ اور شعور کی رو کے) انداز کو ”اگر اپنا یا تو مقصد تجربہ کی سنسنی خیزی تھا اور ایسی ٹولیدگی پیدا کی کہ کسی کے پلے بھی کچھ نہ پڑے۔ ایسی تخلیقات کو خود کلامی سمجھ کر خود کہانی کار کے نفسی تجربہ کے لیے تو استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اگر قاری تک کسی بات کا ابلاغ نہیں ہو پاتا تو پھر ایسے نفسیاتی تجربات بے سود ہوتے ہیں۔ نفسیات انسان کے مطالعہ کا نام ہے اور ادب میں بھی نفسیات سے یہ ہی کام لیا جانا چاہیے لیکن اگر نفسیات کے زیر اثر لکھی

جائے والی تحریر ابلاغ سے عاری محض بے معنی اظہار ہو تو ایسی نفس (۷) ”بہت کس کام کی

سلیم اختر ”جدید“ یا ”جدیدیت“ کا اضافی تصور رکھتے ہیں۔ وہ صرف و محض علامتی اور تجریدی افسانے کو ”جدید افسانہ“ نہیں سمجھتے بل کہ ہر دور کے اس فن کار کو جدید خیال کرتے ہیں جو بینت اور اسلوب کے نئے نئے تجربے کرتا ہو۔ اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ ”جدید کی اصطلاح اضافی ہے چنانچہ جس عہد میں بھی افسانہ میں بینت اور اسلوب کے تجزیے کیے گئے اس عہد کا افسانہ ”جدید“ قرار پایا یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے اپنے رومانی معاصرین کے مقابلہ میں سعادت حسن منٹو۔ اس لیے آج کے چند لکھنے والوں کو جدید قرار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ گذشتہ نصف صدی کے تمام افسانہ نگار خود بخود ہی قدیم (۸) ہو کر متروک قرار پا گئے

اپنے مضمون ”افسانہ: حقیقت سے علامت تک“ میں سلیم اختر نے اردو افسانہ میں حقیقت نگاری، فطرت نگاری، واقعیت نگاری، علامت نگاری اور تجریدیت کی بھرپور وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اردو افسانہ مختلف ادوار میں کس طرح مذکورہ بالا منازل سے گزرا اور مختلف تغیرات سے آشنا ہوا۔ آج اگر علامتی اور تجریدی افسانہ کچھ ذہنوں کے لیے ناقابل قبول بنا ہوا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت سلیم اختر نے ان الفاظ میں کی ہے

”ایک سہانی صبح افسانے کے قارئین پر یہ انکشاف ہوا کہ اردو افسانہ علامت اور تجرید کا موڑ لے چکا ہے۔ گو یہ موڑ آنا ارتقا کے اصول کے مطابق تھا لیکن پھر بھی اس کی مخالفت ہوئی۔۔۔ (کیوں کہ) یہ تبدیلی بالکل اچانک ہوئی اور اتنی اچانک کہ قارئین (بل کہ ناقدین بھی) ذہنی طور سے اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی رجحان کے قطعی صورت ”کی موجودگی کی ضرورت ہوتی Avant Garde میں رومانی سے قبل“ ہے۔ یہ قدیم اور جدید کے درمیان تعارف کا کام کرتے ہیں۔ یہ وہ ہی کردار ہے جو ترقی پسند افسانہ کے لیے پریم چند نے ادا کیا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ سب کے اعصاب پر حقیقت پسند افسانہ یوں چھایا رہا کہ ذہن اس سے ”بو کر رہ گئے“ (۹) ”Conditioned“

دوسری وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ علامتی اور تجریدی افسانہ میں کوئی بھی ایسا افسانہ نگار پیدا نہیں ہوا جس کا پایہ کوشش چندر، بیدی اور منٹو کے ہم پلہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود سلیم اختر یہ سمجھتے ہیں کہ چون کہ علامتی انداز میں لکھنے والوں کا نہ صرف ایک حلقہ بن چکا ہے بل کہ اس حلقے نے متنوع افسانوں کی تخلیق کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ”اس نئے انداز میں سنسنی خیزی نہیں بل کہ چیزے دگر بھی ہے“ (۱۰)۔ یہ ہی وجہ ہے کہ وہ تجریدی اور علامتی افسانے کو اردو افسانے کے ارتقا میں ایک مستحسن اقدام تصور کرتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ افسانے ایسے ہوں کہ کسی حد تک سمجھ آ جائیں

اس طرح سے ہم اگر دیکھیں تو سلیم اختر کا یہ مضمون بڑا متوازن دکھائی دیتا ہے یہاں انہوں نے نہ صرف حقیقت پسند افسانے کی دین کا اعتراف کیا ہے بل کہ علامتی اور تجریدی افسانے نے جن نئی جہات تک رسائی حاصل کی ہے ان کو بھی سراہا ہے

نفسیات سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوی تجزیوں میں جنس اور عورت خاص موضوع رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین ”اردو کا پہلا جنسی افسانہ“، ”اردو افسانے میں عورت“ اور ”نقاوت کا استعارہ۔ منٹو“ قابل ذکر ہیں۔ یلدرم کے افسانہ ”خارستان و گلستان“ کو انہوں نے اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا ہے اور اس افسانے کا عمدہ تجزیہ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کا ”موضوع جنسی جبلت کی قوت ہے“ (۱۱) یلدرم کے اس افسانے کا مطالعہ، سلیم اختر کی اس بات کی تائید کرتا ہے۔ بلا شبہ یہ افسانہ جنسی جبلت کا اظہار ہے۔ اور اگر صاف لفظوں میں کہا جائے تو اس کا موضوع جنس، جنسی بیداری اور تجربہ وصل ہے“ (۱۲) اور پھر یہ بھی کہ سلیم اختر نے یلدرم کے اس افسانہ کو طبع زاد تحریر سمجھ کر مطالعہ کیا ہے کیوں کہ بقول یلدرم ”بہت کچھ تصرف کیا (۱۳) ہے“

اس افسانے کے تجزیہ سے سلیم اختر نے ان ناقدین کے تصورات کو باطل قرار دیا ہے جو ”خیالستان“ کو اسلوب کی رنگینی کی بنا پر رومانی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اور آخر میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب اردو افسانہ کی ابتدا میں ہی جنس موضوع بن چکی تھی تو پھر بعد میں یہ موضوع ٹیبو کیوں بنا؟ اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں

”میری دانست میں اس کی ذمہ داری بھی کسی حد تک یلدرم پر عائد ہوتی ہے۔۔۔ سرسید کی اصلاحی کوششوں اور نذیر احمد کے تعلیمی ناولوں کے بعد ”جنس“ پر افسانہ لکھنا خاصہ دشوار لگا ہوگا سو اس کی خطرناکی کو رنگین اسلوب سے کیمو فلاج کرنے کی سعی کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قارئین تشبیہات اور استعارات میں گم ہو گئے۔۔۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

اردو افسانہ میں جنس کو ایک اہم موضوع کی حیثیت سے تسلیم کرانے کی بدنامی منٹو، عصمت اور دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کے مقدر میں آئی۔ یوں جنسی افسانہ کے مخالفین اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور کا ایک بہت ہی اہم افسانہ جنس کے موضوع پر تھا گو اسلوب کی بنا پر، خاستان و گلستان، اردو افسانہ میں جنس کی روایت کے فروغ کا باعث نہ بن سکا لیکن پھر بھی اسے اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔“ (۱۴) منٹو کی جنس نگاری پر بھی سلیم اختر نے نہایت عمدہ تنقیدی رائے قلم بند کی ہے۔ اگرچہ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ منٹو کی افسانوی حیثیت محض جنس نگاری کی بنیاد پر نہیں مگر منٹو کا ایک اہم موضوع جنس ضرور ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے مختلف ناقدین نے منٹو کی جنس نگاری کو صحیح خطوط پر پرکھنے کی کوشش کی ہے ان میں سلیم اختر کا نام بھی شامل ہے جو منٹو کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

”جنس کی پیش کش کا یہ انداز اس لحاظ سے اہم اور افسانہ میں ایک نیا تجربہ تھا کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں جنس کو عام زندگی سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہ کی منٹو کے افسانوں میں جنس عام زندگی سے منقطع کوئی جداگانہ وقوعہ نہیں بل کہ یہ منٹو کی جینینس کا کمال ہے کہ اس نے جنس کے حوالہ سے زندگی کو سمجھا اور سمجھایا۔ جنس اس کے لیے حیاتیاتی سانحہ یا حالات کے پس منظر اور پیش منظر سے الگ کوئی حادثہ نہیں بل کہ یہ انسانی سانیکی کی تفہیم کے لیے ایک بلیغ استعارہ بھی ہے اور زندگی کا حسن و قبح اجاگر کرنے کے لیے ایک تشبیہ بھی۔“ (۱۵) اپنے مضمون ”اردو افسانہ میں عورت“ میں انہوں نے اردو کے معروف افسانوں کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے پریم چند کے افسانے، ”وفا کی دیوی“ اور ”مس پدما“، علی عباس حسینی کا افسانہ ”میلہ گھومنی“، بیڈی کا ”کوکھ جلی“، حسن عسکری کا ”حرام جادی“، عصمت کا ”لحاف“، منٹو کا ”تک“، ممتاز مفتی کا ”آپا“، احمد ندیم قاسمی کا ”سناتا“، قرۃ العین حیدر کا ”بت جھڑ کی آواز“، مرزا ادیب کا ”مانی پھاتان“ اور خدیجہ مستور کے افسانہ ”راستہ“ کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سلیم اختر کے یہ مطالعے، تجزیے کا حق ادا کرتے ہیں مگر انوار احمد کا یہ اعتراض بھی درست دکھائی دیتا ہے کہ

”وہ (سلیم اختر) پریم چند کے افسانوں کے نمائندہ نسوانی کرداروں میں ملیا (وفا کی دیوی) اور مس پدما (مس پدما) کو منتخب کرتے ہیں۔ حالانکہ آشا (نئی بیوی)، رام پیاری (مالکن) اور بوڑھی کاکھی (بوڑھی کاکھی) شاید پریم چند کے بہتر نسوانی نمائندے ہیں، اسی طرح ان کی طویل فہرست میں سے قدرت اللہ شہاب کی ماں جی (ماں جی) اور ممتاز شیریں کی نانی امان (آنینہ) کا غائب ہونا تعجب خیز ہے۔“ (۱۶) بہر حال سلیم اختر کا اپنے اس انتخاب سے متعلق جواز ہمیں ان کے درج ذیل اقتباس سے فراہم ہوتا ہے جہاں وہ لکھتے ہیں

”ان میں سے ہر ایک افسانہ میں عورت کی فطرت کے کسی پہلو کو فن کارانہ چابک دستی سے یوں اجاگر کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو اگر وہ بحیثیت مجموعی متاثر کرتی ہے تو دوسری طرف کسی نہ کسی سماجی طبقہ کی علامت بھی بن جاتی ہے اور یوں یہ افسانے اچھے خاصے موزیک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس سے پاک و بند کی عورت کی تصویر ابھرتی ہے اگر یہ تصویر تمام جزئیات میں مکمل نہ معلوم ہو تو اس کا جواب یہ ہی ہو سکتا ہے کہ نظر افروز ہوتے ہوئے بھی عورت رنگ بدلتی ہے۔“ (۱۷)

سلیم اختر کی تنقید کا بنیادی سروکار اگرچہ نفسیات ہی ہے مگر وہ افسانوں کو سماجی اور عمرانی نقطہ نظر سے بھی دیکھتے ہیں اور خاص طور پر اردو افسانہ کو عصری زندگی سے وابستہ اور اس کا عکاس سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا یہاں تک کہنا ہے کہ ”ہماری تاریخ کے ہر موڑ پر ہماری تہذیب کی ہر کروٹ پر اور ہمارے تمدن کے ہر تغیر پر کہانی نے زندگی کا ساتھ دیا ہے۔“ (۱۸)

ہمارے کچھ ناقدین کا اردو افسانہ پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اردو افسانے میں ساری دین یورپی زبانوں کے افسانوں کی ہے۔ یعنی ہمارے افسانہ نگار، یورپی افسانہ نگاروں کی تقلید کرتے ہیں اور مختلف مغربی تحریکوں اور مصنفوں کے زیر اثر افسانے تخلیق کرتے ہیں۔ اور صرف اسلوب اور تکنیک ہی نہیں بل کہ موضوعات بھی مغرب سے مستعار لیے جاتے ہیں۔ اگر فیشن زدگی کا شکار اور مغرب کی طرف تقلیدی رویہ رکھنے والے افسانہ نگاروں کو ایک طرف کر دیا جائے تو تخلیقی افسانہ نگاروں سے متعلق یہ اعتراض درست نہیں۔ ایسے میں سلیم اختر کا موقف بڑا سنبھلا ہوا اور حقیقت پر مبنی ہے۔ وہ ایسے ناقدین کی آرا کو چھٹلاتے ہیں اور لکھتے ہیں

”ہمارے افسانہ نگاروں نے تکنیک اور اسلوب کے ضمن میں کیے گئے

تجربات کے لیے بے شک بابر سے انسپیریشن حاصل کیا مگر جہاں تک افسانہ کے موضوعات یا زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالنے کا تعلق ہے یا عصری زندگی سے وابستہ حوادث اور وقوعات کے تجزیہ کا تعلق ہے تو سب افسانہ نگار روح عصر کے تابع نظر آتے ہیں چنانچہ ہمارے قابل ذکر افسانہ نگاروں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے اپنے افسانوں کو معاشرہ کا آئینہ نہ بنایا ہو، معاشرہ کے داخلی تضادات اجاگر نہ کیے ہوں اور افراد کی کرداری منافقت واضح نہ کی ہو اور یہ ہی اصل اور بنیادی بات ہے یوں دیکھیں تو ہمارا افسانہ اپنی دھرتی پر قائم اور ثابت نظر آتا ہے اور اسی میں اردو افسانہ کی انفرادیت اور اہمیت مضمر ہے۔“ (۱۹) مجموعی طور پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو افسانے کی تنقید کو نفسیاتی شعور سے متصف کیا اور نفسیاتی اصطلاحات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ”تکرار“ کی خامی ان کی تنقید میں ضرور در آئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کی بل کہ فکشن کی تنقید پر ان کی کتابیں مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہیں۔ لیکن نفسیاتی زاویہ نظر اور اسلوب کی دل کشی ان کی تنقید کو معتبر بناتی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی جو ان کی تنقید میں نظر آتی ہے اس کی طرف ارتضیٰ کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلانی ہے۔ لکھتے ہیں ”وہ (سلیم اختر) افسانے میں کردار کی نفسیاتی تحلیل پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اس کی عدم موجودگی میں کسی افسانہ کو، غیر افسانہ نہیں کہتے۔ بل کہ ان کے نزدیک ہر نوعیت کے افسانے کی گنجائش ہے اگر اس میں فن کا لحاظ باقی ہے۔ عموماً کسی خاص مکتب فکر کے ناقدین دوسرے زاویہ نگاہ کے حامل فن پاروں کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ لیکن سلیم اختر جن کا تعلق تنقید کے نفسیاتی دیستان سے ہے، ادب کے دوسرے دیستانوں کو بھی قابل اعتنا سمجھتے ہیں۔ اسے یہ یک جنبش قلم رد نہیں کرتے۔“ (۲۰)

حوالہ جات

1. سلیم اختر، ڈاکٹر: ”فکشن ٹیکنیک کا نفسیاتی مطالعہ“، بشمول ”افسانہ اور افسانہ نگار“، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1991، صفحہ 17
2. اس کے علاوہ، صفحہ 18.
3. اس کے علاوہ، صفحہ 16.
4. اس کے علاوہ، صفحہ 16.
5. اس کے علاوہ، صفحہ 22 سے 23
6. ارتضیٰ کریم کے حوالے سے: ”اردو افسانے کی تنقید“، لاہور، کتاب دنیا، 1999، صفحہ 439
7. سلیم اختر، ڈاکٹر: ”فکشن ٹیکنیک کا نفسیاتی مطالعہ“، بشمول ”افسانہ اور افسانہ نگار“، صفحہ 19
8. نیز، ”جدید افسانہ“، بشمول صفحہ 58
9. اس کے علاوہ، افسانہ حقیقت سے علامت تک، بشمول سمبولزم، مرتب اشتیاق احمد، لاہور، بیت الحکمت، 2005، ص 178
10. اس کے علاوہ، صفحہ 182.
11. اس کے علاوہ، ”اردو کا پہلا جنسی افسانہ“ بشمول ”افسانہ اور افسانہ نگار“، ص 91
12. اورنگزیب عالمگیر، ڈاکٹر: ”سجاد حیدر یلدرم: تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ“، لاہور، سنگت پبلشرز، 2005، ص 74
13. ”پر ایک نظر Fairyland“: مبارز الدین رفعت کے حوالے سے، سید از سجاد حیدر یلدرم، لاہور، سنگ میل پبلی، ”Fairyland“ بشمول کیشنز، 1996، صفحہ 14
14. سلیم اختر، ڈاکٹر: ”اردو کا پہلا جنسی افسانہ“، بشمول ”افسانہ اور افسانہ نگار“، ص 98
15. اس کے علاوہ، ”بغاوت کا استعارہ۔ منٹو“، بھی شامل ہے، صفحہ 149.
16. انوار احمد، ڈاکٹر: ”ڈاکٹر۔ اردو افسانے کی تنقید میں سلیم اختر کا مقام جس میں ”یک جا“، ملتان، بیکن ہاؤس، 1997، صفحہ 150.
17. سلیم اختر، ڈاکٹر: ”اردو فکشن میں عورت“، بشمول ”افسانہ اور افسانہ نگار“، ص 105.
18. نیز ”ادب اور عصری آگہی۔ افسانہ“، بھی شامل ہے، ص 26.
19. اس کے علاوہ ”جدید افسانہ“ بھی شامل ہے، ص 57.
20. ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر: ”اردو افسانے کی تنقید“، صفحہ 441 تا 442.